مطبوعات

الحسین | مؤلفہ جناب ابوالنصر۔ مترجمہ: شیخ محمد احمد پانی پتی۔ شائع کردہ: مکتبہ جدید، انارکلی، لاہور۔ قیمت مجلد معہ گرد پوش ۸ روپے۔

حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما، واقعۂ کربلا، اور اس واقعہ کا وسیع پس منظر ہماری تاریخ کے اہم موضوعات میں سے ہیں۔ پھر چونکہ ان موضوعات کے بارے میں جمہور اہل سنت، شیعہ حضرات اور خارجی گروہ کے درمیان شدید اختلافات ہیں، ہر کسی نے تاریخ کی تعبیر اپنے انداز سے کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے تاریخ کے یہ ابواب اہمیت کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی پیچیدگی بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔

اس فتنوں بھرے دورِ تاریخ کا ریکارڈ ایک طرف تو جمہور مسلمین کے خلاف شیعہ و خوارج کے صف آرا ہو جانے کی وجہ سے بے شمار غلط فہمیوں اور مبالغہ آرائیوں سے بھرا پڑا ہے اور دوسری طرف اس میں کام کرنے والی شخصیتیں ایسی عظمت مآب ہیں کہ حقائق کا تجزیہ کرنے میں مؤرخ اور سوانح نگار بڑی مشکل میں پڑ جاتے ہیں یہی صورت کارنامۂ حسینؓ کے مؤرخین کو پیش آتی ہے۔

اس موضوع پر زیرِ نظر کتاب بظاہر بڑے محققانہ عزائم کے ساتھ لکھی گئی ہے، لیکن ان عزائم کے باوجود مثبت پہلو سے کوئی بڑی ندرتِ فکر سامنے نہیں آئی اور نہ واقعات کا مطالعہ و تجزیہ کسی مختلف اسلوب سے کیا گیا ہے۔ تاہم یہ کتاب ایک گونہ علمی مرتبہ رکھتی ہے اور تیسرے درجے کے مضمون نگارانہ انداز کی چیز نہیں ہے۔

اس کے اوّلین اوراق کو پڑھنے سے آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت یافتہ مسلم سوسائٹی میں خلافت کے مسئلے کو اس طرح لیا گیا تھا جیسے کسی متوفی کی جائداد کے استحقاق کا مسئلہ موجبِ نزاع بنا ہوا ہو اور جاہ طلبوں کے مختلف گروہ ایک دوسرے سے کشمکش کر رہے ہوں جیسے نظامِ امارت و حکومت کے بارے میں کتاب و سنت نے سرے سے کوئی رہنمائی نہ دی ہو اور کسی اصولی ہدایت کا سروسامان نہ کیا ہو۔ سقیفہ بنو ساعدہ کے اجتماع کی جن بحثوں کو عام کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی غیر معمولی حیثیت کا حامل قرار

دیا گیا ہے، وہ درحقیقت دنیا کی کسی پارلیمنٹ اور شوریٰ کی اس موضوع پر ہونے والی معمولی بحثوں سے مختلف نہیں ہیں، اور اس مجلس کی برتری اور اس کے شرکاء کی صاف دلی کا روشن ثبوت یہ ہے کہ ذرا سے وقفے میں معاملہ سلجھ جاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ مسئلہ متفقہ طور پر حل نہ ہو سکا۔ حالانکہ کسی اقلیت (بلکہ دو چار افراد) کے اختلاف کے باوجود جمہوری و شورائی نظام میں زعماء کی عظیم اکثریت جس فیصلے پر جمع ہو جاتی ہے اسے انسانی زبان میں ہمیشہ متفقہ فیصلہ کہا جاتا ہے۔ مؤلف کی نگاہ میں حضرت علی اپنے رفیقِ مسلک حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کو برحق ماننے پر اپنے آپ کو کبھی تیار نہ کر سکے۔ مگر تاریخ کا کوئی محقق اس بات کو قبول نہیں کر سکتا۔ حضرت علیؓ کا اختلاف عارضی تھا اور بعد میں آپ نے اپنا فرائض تعاون امیر المؤمنین کے سامنے پیش کر دیا۔ تاہم مؤلف ذاتی طور پر خلافت کے نظریۂ شورائی ہی کے قائل ہیں، جیسا کہ صفحہ ۱۵ کے پہلے پیراگراف سے واضح ہے۔

مؤلف کی اس رائے سے ہم اتفاق کرتے ہیں کہ شخصی بادشاہت کا دور شروع ہو جانے کے بعد حکمرانوں کو "خلیفہ" کا نام دینا اس اصطلاح کا نہایت غلط استعمال ہے۔ اور ہم اس سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ جناب معاویہ ہی کے ہاتھوں شخصی بادشاہت کا دروازہ کھلا ہے، چاہے ان کی نیت کتنی نیک ہو اور چاہے ان کے اقدام کو اجتہادی غلطی قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں مؤلف نے یہ دکھایا ہے کہ حضرت علی کا ذہن صدفی صد دینی تھا اور ان کے مقابلے میں امیر معاویہ کا اندازِ فکر سیاسی تھا۔ یہ تقابل بہت قابلِ غور ہے۔ امیر معاویہ جو دورِ خلافت اور دورِ ملوکیت کی درمیانی کڑی ہیں اور بہت سے وجوہ سے مسلمانوں کی نگاہ میں قدر و قیمت بھی رکھتے ہیں، مؤلف نے ان کا مؤرخانہ احتساب کرتے ہوئے بعد کے مصائب کی ذمہ داری ان پر ڈالی ہے۔ (ص ۵۰۰)

امام حسینؓ کی سرگزشت جس طرح بیان کی گئی ہے، فی الجملہ وہ مطابقِ واقعہ ہے۔ سلسلۂ واقعات کا یہ پہلو بہت ہی قابلِ غور ہے کہ آپ جب کوفہ کے ارادے سے نکلتے ہیں تو آپ کے تمام محب اور خیر خواہ آپ کو باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان سب کے مشوروں کے جواب میں امام حسین کی طرف سے جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی سیاسی استدلال پر مبنی نہیں اور نہ حالات کے جائزے کی روشنی میں رویہ تجویز کرنے کا اندازِ فکر ان باتوں میں ملتا ہے۔ بلکہ جیسے ایک وجدانی جذبہ ہے جس میں سرشار ہو کر آپ مشہد کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں، جیسے تقدیرِ الٰہی آپ کے قافلے کی عناں بردار ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کوفہ والوں

کے طرزِ عمل کو دیکھ کر حالات کو اپنے ہاتھوں بدل ڈالنے سے مایوس ہو کر اس فیصلے پر پہنچ گئے تھے کہ اب سوئی ہوئی امت کو جھنجھوڑ دینے کے لیے تنہا اپنی جان کی بازی وقت کے فتنہ کے خلاف لگا دینی چاہیے اور اپنے خون کے قطروں کے بیج تاریخ میں ڈال دینے چاہئیں جو ابد میں برگ و بار لاسکیں اور جن کے ذریعے اس امت میں حق کی حفاظت اور باطل کی مزاحمت کے جذبات زندہ رہ سکیں۔ اس فیصلے کے پس منظر میں آپ کا جو اصولی نقطہ نظر کام کر رہا تھا وہ کوفہ والوں کے نام ایک خط میں آپ نے پیش کر دیا یعنی "امام (صدرِ حکومت) وہ ہونا چاہیے جو کتاب اللہ پر پوری طرح عمل کرنے والا ہو، عادل ہو، اور دینِ حق کا فرماں بردار ہو" معاملہ ذاتی یا خاندانی اقتدار کا نہ تھا کہ رسول اللہ کی گدی آپ کے بال بچوں کو میراث میں ملنی چاہیے۔ ساری بازی اسی اصول کے لیے لگائی گئی۔

آپ آگے بڑھتے ہیں، ساتھی جو آ آ کر ساتھ ہو گئے تھے آہستہ آہستہ چھٹتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ شہادت گاہ میں آپہنچتے ہیں۔ پہنچنے سے لے کر شہادت کی آخری ساعت تک جو گفتگوئیں آپ نے مخالفین سے کی ہیں اور جو تقریریں فرمائی ہیں ان کے ایک ایک بول سے پتھر بھی پانی ہو کر بہہ سکتا ہے، مگر وہ جانے کیسے انسان اور کیسے مسلمان تھے جن کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی بلکہ بے رحمی سے لڑے، نہایت بزدلانہ طریق سے عورتوں اور بچوں پر ظلم ڈھائے، پانی بند کرنے کی ذلیل کارروائی کی، اور پھر درندوں کی طرح امت کے عظیم ترین نوجوان پر جھپٹ پڑے، حد یہ کہ اسکی لاش کو گھوڑوں کے سموں سے روندا ——— اور یہ سلوک اہلِ اسلام نے کبھی بدترین کفار کے ساتھ بھی روا نہ رکھا تھا۔ یہ حالات پڑھ کر آدمی کا سر چکرا جاتا ہے کہ حکومت جب معاشرے کو بگاڑنے پر تُل جاتی ہے تو آناً فاناً بگاڑ کہاں تک جا پہنچتا ہے۔ کوئی نہ تھا جسے وقتی اشتعال ہی آجاتا، کوئی نہ تھا جو ہمہ تن احتجاج بن کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ ڈر اور لالچ، دو عوامل نے اکابر و عوام سب کو حکومت کا بے بس آلۂ کار بنا دیا تھا۔ دوسری طرف اس گرداب بلا میں آئے ہوئے امام اور ان کے ساتھیوں نے جس شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثالیں نایاب ہیں۔ تاریخ نگاروں نے بعض مصالح کے تحت قتلِ حسین کی ذمہ داری کا تمام تر بوجھ یزید کے بجائے ابن زیاد اور شمر کے سر ڈالا ہے۔ اس کتاب میں بھی یہی نقطۂ نظر بطور روایت دُہرایا گیا ہے۔ لیکن حکمران ان تمام واقعات و حوادث کا ذمہ دار ہے جو اس کے نمائندوں کے ذریعے اس کی حدودِ سلطنت میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور پھر یزید کے ذہن و اخلاق کو سامنے رکھیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس کا دفاع کیا جائے۔ محض یہ بات یزید کو سندِ تقدس نہیں دے دیتی

کہ اس کو ایک صحابی نے نامزد کیا ہے۔ یزید پر قتلِ حسین کی پوری پوری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

اس داستانِ درد کا ایک اہم رُخ ہے جو واعظوں اور مقرروں اور ذاکروں اور شاعروں نے بالکل اوجھل کر دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ امام حسین نے آخر دم تک اس بات کی سعی کی کہ مسلمانوں کے اندر ان کی وجہ سے جنگ و جدال نہ ہونے پائے۔ چنانچہ تین صورتیں آپ نے ابن زیاد کے سامنے رکھیں: ایک یہ کہ جہاں سے آپ آئے ہیں وہیں لوٹ جائیں، دوسرے یہ کہ کسی سرحدی علاقے کی طرف چلے جائیں، تیسرے یہ کہ آپ کو یزید کے پاس لے جایا جائے اور بالمشافہ اپنا معاملہ طے کریں۔ لیکن ابن زیاد اور شمر نے ان تینوں صورتوں کو مسترد کر کے اپنی قسمت میں لکھے ہوئے سنگدلانہ اقدام کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گویا امام حسین کی طرف سے حجت ہر طرح پوری ہو گئی۔

مؤلف نے تاریخ کے اس خونیں باب کے مطالعہ کے ذریعے قارئین کو جس نتیجہ تک پہنچانا چاہا ہے وہ عجیب ابہام اپنے اندر رکھتا ہے۔ استنتاج کی فصل کا عنوان ہے "وحدتِ اسلامی کی اپیل"۔ اس فصل میں اگرچہ "اعلائے کلمۃ الحق" اور "اسلام کے جھنڈے کو سربلند رکھنے" کی کوشش کے الفاظ بھی ملتے ہیں لیکن مغزِ کلام یہ ہے کہ امام حسین مسلمانوں کو تفرقہ و اختلاف سے بچانے کے لیے اُٹھے تھے، کیونکہ یزید کی حکومت پر مسلمانوں کا جمع ہونا ممکن نہ تھا اور آپ کی ذات سب کا مرجع اعتماد بن سکتی تھی۔ چنانچہ کتاب کا مقصد آخری سطر میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ "مسلمانوں میں باہمی اتحاد کی سچی تڑپ پیدا ہو جائے"۔ ہم صاف صاف عرض کریں گے کہ شہادتِ حسین کا اصل سبق یہ ہرگز نہیں ہے۔ وہاں سے تو ایک سبق یہ ملتا ہے کہ مسلمان گروہ کو کبھی بھی کسی غیر اسلامی یا فاسد نظامِ حکومت کے تحت مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ رہنا چاہیے، بلکہ اس کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے، دوسرا سبق یہ ملتا ہے کہ اگر حالات کی اصلاح کے لیے منظم تحریک کو آگے بڑھانے میں عوام کی بے حسی مانع دکھائی دے تو چند شخصیتوں کو اپنی جان کی بازی لڑا کر اس خوابیدہ حس کو جھنجھوڑنا لگانا چاہیے۔ اور تیسرا سبق یہ ملتا ہے کہ با اصول اور خوددار آدمیوں کو سچائی پر قدم جماتے ہوئے ہر قسم کے ظلم و تشدد کو ہمت و شجاعت سے برداشت کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کتاب ان اصل اسباق کو سامنے نہ لا سکی۔

اس تنقید سے مقصود کتاب کی تنقیص نہیں ہے۔ فی الجملہ یہ کتاب خاصی محنت سے لکھی گئی ہے۔ زبان بھی مناسب ہے، اور خوبصورت ٹائپ میں اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔ ترجمہ بھی اچھا معلوم ہوتا۔

کاروانِ حجاز از قلم جناب ماہر القادری، مدیر ماہنامہ فاران (کراچی)۔ شائع کردہ: مکتبۂ فاران، کراچی۔ قیمت مجلد مع گرد پوش للعہ۔

اللہ کی راہ میں جہاد اور ہجرت کے ساتھ ساتھ حج کا سفر دوسری ساری جادہ پیمائیوں پر فضیلت رکھتا ہے اس میں ایک گونہ مجاہدہ بھی ہے اور یہ ایک نہج سے شانِ ہجرت بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسے سفر کا سفرنامہ اگر کسی صاحبِ دل نے لکھا ہو تو یقیناً اس سے ایمان، عقل اور جذبات کو نئی زندگی ملتی ہے۔ کاروانِ حجاز ایک ایسی ہی رُوداد سفر ہے جس میں ماہر القادری نے اپنے تاثرات و مشاہدات پیش کیے ہیں۔ کتاب کی سطر سطر گواہی دیتی ہے کہ دین کا جذباتی عنصر جس سے ساری گرماگرمی رہتی ہے، ماہر کے ہاں فراواں ہے۔ یہ عنصر اگر حدود کو پھاندنے لگے تو اس سے زیادہ خطرناک کوئی اور چیز نظامِ دین میں نہیں ہو سکتی، لیکن ماہر کا جنون بھی اتنا ہوشیار ضرور ہے کہ ایمان کی سرحدوں سے کہیں تجاوز نہیں کرتا۔ ایک طرف توحید کے تقاضے ملحوظ ہیں، دوسری طرف محبت رسولؐ سنت رسولؐ کی پابند! جہاں کوئی نازک مقام آتا ہے، ماہر القادری فوراً محتاط ہو جاتے ہیں۔

سفرنامہ میں بہت سی ملاقاتوں اور گفتگوؤں کا بیان ہے۔ ازاں جملہ ایک مقام پر سید محمد طلحہ کا تذکرہ ملتا ہے جو سید احمد شہیدؒ کے خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ موصوف ایک تحقیقی تصنیف میں معروف ہیں جس کا عنوان الحیات فی قرون الاول" ہے۔ اس کتاب میں دورِ صحابہ کی زندگی کا پورا نقشہ سامنے لانا مدِ نظر ہے۔ گفتگو میں آپ نے بیان فرمایا کہ ایک قدیم عربی کتاب میں ان کھیلوں کا تذکرہ ملا ہے جو دورِ صحابہ کے بچوں میں رائج تھے۔ اگر یہ کتاب تکمیل پا کر سامنے آئی تو ہمارے لٹریچر میں گراں بہا اضافہ ہوگا۔

سرزمینِ عرب میں جانے والے قادیانیوں کے بارے میں تو اجمالاً اچھی خاصی تحقیق شاملِ کتاب ہے۔ پاک و ہند کے کچھ تاجر پہلے پہل عرب میں داخل ہونے اور جدہ میں انہوں نے اپنے مادی کاروبار کے ساتھ ساتھ مذہبی کاروبار بھی شروع کر دیا۔ روپیہ پیسہ دے کر لوگوں کے ایمان خریدنے کے درپے ہوئے۔ آخر بات نکل گئی اور پولیس نے ان کے ہاں سے وہ رجسٹر بھی برآمد کر لیے جن میں ان کے متاثرین کی فہرستیں درج تھیں اور جن کو تنخواہیں اور وظائف دیئے جاتے تھے۔ یہ لوگ وہاں "قنتی" کے نام سے مشہور ہوئے حکومت نے ان کے نشر کی اب پوری طرح روک تھام کر دی ہے۔

ایک اہم مذکور اس کتاب میں پاکستانی سفارت خانے کے متعلق ملتا ہے۔ ماہر صاحب بتاتے ہیں کہ ہندوستانی سفارت خانے کے قونصل جنرل مسٹر قدوائی ہندوستانی حاجیوں کی خبر گیری کے لیے دن رات حجاج میں چکر لگاتے رہتے ہیں، لیکن پاکستانی سفارت کا ہر شخص بادشاہِ بے خبر بنا ہوا ہے۔ پاکستان سے حکومت نے جو طبی مشن بھیجا اس کے انچارج ڈاکٹر کو شکایت رہی کہ سفارت خانہ نے مشن کو حاجیوں کی خدمت کا پورا موقع ہی نہیں دیا۔ پاکستانی سکے کی گرتی ہوئی قیمت کا بھی اپنے تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر مؤلف نے ماتم کیا ہے۔ حد یہ کہ لوگ پاکستانی نوٹ کی صورت سے بھاگتے تھے۔ جب کسی ملک کے حکمران اور رہنما تعمیر و ترقی میں لگنے کے بجائے مفاد و منصب کے کھیل میں لگ جاتے ہیں تو نتیجہ یہی نکلتا ہے۔

کتاب میں تجربات اور اسباق بھرے ہیں، جا بجا اپنی تاریخ کے مختلف گوشوں پر بحثیں ہیں، بہت سے مسائل فقہی کا تذکرہ ہے، آخر میں "گذارش اور مشورے" کے زیر عنوان حج کی ترغیب دلانے اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کے لیے بڑی مؤثر سطور نگاہ سے گزرتی ہیں۔ خاتمہ حمد و نعت کے اشعار پر ہوتا ہے

یہ سفرنامہ دینی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے اردو تحریروں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے

امامیہ مشن کا لٹریچر | از قلم: سید العلما سید علی نقی النقوی، مجتہد العصر۔ ملنے کا پتہ: سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ۔ اردو بازار۔ لاہور۔

حسب ذیل رسائل برائے تبصرہ موصول ہیں: (۱) خدا کا ثبوت (۲) حسین اور اسلام (۳) شجاعت کے مثالی کارنامے (۴) خاندانِ حسین کا مذہب (۵) محاربہ کربلا (۶) اسیریٔ اہل حرم۔ علی الترتیب قیمتیں ۲ر، ۳ر، ۴ر، ۸ر، ۵ر اور ۳ر ہیں۔

یہ رسائل ہمارے شیعہ بھائیوں کے مکتب فکر کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ان میں اگرچہ مناظرانہ ڈگر کو چھوڑ کر کسی قدر نیا اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن مسائل اور بحثیں وہی ہیں جن پر صدیوں سے جھگڑے ہو رہے ہیں۔ مگر ان جھگڑوں سے کسی کی بگڑی نہ بن سکی۔ ہم اس لٹریچر کے مباحث پر کوئی گفتگو کرنے کے بجائے صرف اتنا کہیں گے کہ اس میں انسانیت کے نام کوئی ایسا پیغام نہیں ہے جو اس کو زندگی کے عملی خارزار میں سے بہ سلامت نکال لے جائے۔ اس میں کوئی نظریۂ سیاسی نہیں ملتا، اس میں موجودہ معاشی گتھیوں کو سلجھانے کا سر و سامان نہیں ہے، اس میں قوموں کو باہمی تصادم سے بچا لینے

کی کوئی سبیل نہیں بیان کی گئی ہے۔ اس میں الحاد کی بنیادوں پر قائم ہونے والی تہذیب جدید کے طوفانی حملے کا کوئی توڑ سامنے نہیں لایا گیا، اس میں قدیم اور جدید جاہلیتوں کا شکار ہوتی ہوئی عورت کو کوئی راہ نجات نہیں بتائی گئی، اس میں سرمایہ داری اور کمیونزم سے ٹکر لینے والا کوئی نظریہ نہیں دیا گیا، اس میں کوئی فلسفۂ تاریخ نہیں ملتا، اس میں کوئی نظام اخلاق نمایاں نہیں ہوتا ــــ الغرض اس میں سرے سے دورِ حاضر کے اجتماعی انسان کو مخاطب ہی نہیں کیا گیا۔ بس مسلمانوں کے اندر کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کے خلاف اپنی شکایات بیان کی ہیں، اپنا مقدمہ پیش کیا ہے، اپنی طرف سے الزامات لگائے ہیں، اور اپنے آپ کو ایک علیحدہ جتھا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ مقدمہ صحیح ہے یا غلط، گذشتہ کئی صدیوں سے یہ اسی طرح پیش ہوتا رہا ہے، اس پر بحثیں ہوئی ہیں، مناظرے ہوئے ہیں، سر پھٹول ہوئی ہے، لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ کسی فریق کی کونسی بگڑی اس کے ذریعے سنور گئی ہے۔ اور آج ہم پوچھتے ہیں کہ پوری دنیا کو چھوڑ دیجئے، پاکستان کا کونسا بھلا اس میں ہے۔ خدا کے لیے شیعہ سنی جھگڑے سے ذرا بالاتر ہو کر پوری آبادی کو لے کر اس کے اخلاق، اس کے اعمال، اس کے کیریکٹر، اس کے لین دین، اس کے آمد و صرف، اس کی خانگی اور کاروباری زندگی، اس کی سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کا جائزہ لیجیے کہ کس درجہ کی تباہی سے آپ دوچار ہیں ــــ پنج تن کے معتقدین کی اخلاقی سطح کیا ہے اور خلفائے اربعہ کے محبوں کا معیارِ تقویٰ کہاں تک پہنچتا ہے۔ جائزہ لیجیے اور پھر خدا کے لیے اس پستی سے خود نکلنے اور دوسروں کو نکالنے کی جدوجہد کیجیے۔ آپ دوسروں کے خلاف بحثیں اٹھانے کے بجائے اپنے گروہ کی زندگی کو بنائیں اور دوسرے آپ کے خلاف مناظرے کرنے کے بجائے اپنی فکری و اخلاقی تعمیر کریں۔ ورنہ الحاد کی عالمگیر طاقت کے سیلاب کے سامنے نہ آپ رہیں گے، نہ دوسرے:

اگر آپ کے نزدیک سچا دین و مذہب آپ کے حلقے میں محفوظ ہے تو پھر اس پریشان حال دنیا کے سامنے آپ اس نظامِ زندگی کی تصویر پیش کیجیے جس کے آپ امانت دار ہیں اور بتائیے کہ آپ کا دین و مذہب وقت کے مسائل کو کیسے حل کرتا ہے۔ محض یزید کو گالیاں دینے اور امام حسین کا ماتم کرنے سے تو انسانی زندگی بن سنور نہیں سکتی۔

NEW ERA. | بادارت: خورشید احمد و ظفر اسحٰق انصاری - مقام اشاعت: آرام باغ روڈ، کراچی - چندہ سالانہ دس روپے، فی پرچہ ۴ آنے۔

پریس اور صحافت اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہونے والی بہت بڑی طاقت ہے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ طاقت شخصی اور گروہی مفاد و اغراض کی آلۂ کار بن کر بے اصولے پن کے روگ میں مبتلا ہے بخصوصیت سے انگریزی صحافت تو ہمہ تن ایک خاص طبقے کی ترجمان ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک بہت بڑی مسلمان سلطنت کے عوام کے رجحانات کی ترجمانی کا کوئی اطمینان بخش ذریعہ موجود نہیں ہے۔ چنانچہ انگریزی پریس میں احیائے اسلام کی اس تند و تیز رَو کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی جو جمہور کے فکری سمندر میں مدت سے چل رہی ہے۔

ایسے حالات میں ایک مختلف نوعیت کے انگریزی اخبار کا خلا شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ غالباً اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے ہفتہ وار "نیو ایرا" جلوہ گر ہوا ہے۔ ضرورت اگرچہ روزنامے کی ہے، لیکن آغازِ کار اگر ہفت روزہ جریدے سے بھی ہوا ہے تو یہ بہر حال امید افزا ہے۔ اس اخبار کی ادارت دو ذہین اور حسّاس نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے جن کے علم و مطالعہ اور جن کی ترقی کرتی ہوئی صلاحیتوں سے ایک بہت ہی اچھے مستقبل کی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ یہ دونوں نوجوان مسلم طرزِ فکر کے حامل ہیں اور ان کے جذبوں میں جان اور اندازِ تحریر میں ندرت موجود ہے۔

"نیو ایرا" کا نام بڑا معنی خیز ہے۔ یہ درحقیقت اس تاریخی حقیقت کا مظہر ہے کہ دنیائے اسلام کی نئی نسل ایک دعوتِ نَو کی تخلیق کے درپے ہے۔ نیو ایرا اسی صبحِ فردا کی اذان ہے۔ اگرچہ معنوی سنجیدگی کے تقاضے سے اخبار کو صوری لحاظ سے جامۂ سادگی پہنایا گیا ہے تاہم کاغذ، ٹائپ، عنوان بندی اور ترتیب میں خاصا ذوقِ جمال کام کر رہا ہے۔ دو تین شماروں میں جو مضامین، بحثیں، تفریحی اجزا، معلوماتی تصاویر، اداریے اور نوٹ سامنے آئے ہیں وہ مغز کے لحاظ سے معلومات افزا، فکر کے لحاظ سے اصول پسندانہ اور زبان کے لحاظ سے ادب افروز ہیں۔ یہ بہت اچھا ہے کہ نیو ایرا گروہی تعصب کے بندھنوں سے آزاد ہو کر فرض کی راہوں پر گامزن ہوا ہے اور بجا طور پر اسے ہر پاکستانی اپنا اخبار سمجھ سکتا ہے۔ توقع ہے کہ پاکستان کے دَورِ تعمیر میں یہ اہم پارٹ ادا کر سکے گا۔ ہم بڑی مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔